سید باقر رضا زیدی* شاہانہ زیدی**

اردو غزل بیانِ میر و غالب: دبستانِ دلّی کی دروں بینی

URDU GHAZAL FROM THE WORDS OF MIR & GHALIB

Abstract: *"Dabbistan-e-Delhi" is neither a poetic nor prose masterpiece but a forewarning of changing times. Early Urdu ghazals focused on themes of love, separation, and heartbreak. However, political, economic, and social turmoil shifted this focus towards despair, failure, and loss. Over 150 years, the ghazal reflected the pain and hopelessness of Delhi's streets, capturing the cries of longing and despair. Poets like Mir and Ghalib symbolized this era's intense emotions, mourning the city's decline as deeply as personal heartbreak.*

Keywords: *Meer Taqi Meer, Mirza Ghalib, Urdu Ghazal, Dabbistan-e-Delhi.*

تلخیص: "دبستان دہلی" نہ تو شاعرانہ فن کی مثال ہے اور نہ نثری انداز کی نشانی، بلکہ آنے والے وقتوں کی پیشگوئی ہے۔ ابتدائی اردو غزلوں کے موضوعات محبت، جدائی اور درد دل پر مرکوز تھے۔ لیکن سیاسی، اقتصادی اور سماجی حالات کے طوفان نے موضوعات کو مایوسی، ناکامی اور شکست کی طرف موڑ دیا۔ ڈیڑھ سو سالوں کے سفر میں غزل نے دہلی کی گلیوں کی درد بھری، بے امید داستانوں کو بیان کیا۔ میر اور غالب جیسے شاعروں نے اس دور کے گہرے جذبات کو اجاگر کیا اور شہر کی زوال کو اپنے ذاتی دکھ کی طرح محسوس کیا۔

کلیدی الفاظ: میر تقی میر، مرزا غالب، اردو غزل، دبستانِ دہلی۔

وقار حرف و لفظ—نقطہ، معانی و مفاہیم کی اس ہفت اقلیم میں پھیلی ہوئی موجودہ سے لے تا در تصورات ہر شے اپنے وجود سے منسلک تعریف کی نسبت ایک دوسرے سے جدا ہے۔ علم کے جہانوں سے تاریخ کے بیابانوں تک ہر شے کو قوت آواز و پرواز نقطے نے عطا کی نقطے سے نکتہ تک کا سفر، تغیرات سے تفکرات تک کا سفر، عدم سے وجود اور پھر عدم تک کا سفر بنا نقطہ کی دریافت کچھ نہ تھا۔

یہی نقطہ جب عروج کو پہنچا تو کہہ اٹھا بنا میرے 'کن' کے معنی کچھ نہیں۔ بقول شاعر پروفیسر سید محمد کاظم،

؎ شاہد ہے خود قلم نقطہ ہے ابتداء خالق نے کائنات کو نقطہ میں رکھ دیا

*لیکچرر، شعبہ، اردو، SNAK گورنمنٹ سپیریئر کالج، خیر پور۔
**اسسٹنٹ پروفیسر، شعبہ، اردو، SNAK گورنمنٹ سپیریئر کالج، خیر پور۔

نقطہ نے بخشا حرف کو آواز کا لباس نقطہ نا ہو تو لفظ و معانی میں ربط کیا
نقطہ سے پہلے کچھ بھی نا تھا اس جہان میں نقطہ نے "کن" کو قوتِ تخلیق کی عطا(۱)

بغیر' میں (نقطہ) حدیث قدسی "کنت کنزاً مخفیہ" بے معنٰی و بے تاثیر۔ نقطے کی دریافت نے بحر تحریر میں موجوں کو طلاطم بخشا ، تحریر کے موسم کو رنگ و بو عطا کیا، خرد پرستوں کو خرد پیمائی سکھائی تجسس و تفحص کے میلان عطا کیے اسی نقطے نے دل کی دہلیز پر براجمان غم و اندوہ سے آسودگی تک کی کیفیات کو لفظ لفظ جوڑ کر انسان کو بشکلِ شاعری اظہارِ مدعا بخشا۔ اسی اظہارِ مدعا نے پھر نقطہ سے نکتہ تک کا سفر طے کر کے حالات و واقعات کا وہ نقشہ کھینچا کہ صدیاں بیت جانے پر بھی میر تقی میرؔ کے اشعار کے فقط یہ مصرعے دلّی جو ایک شہر تھا عالم میں انتخاب یا دلّی کے نہ تھے کوچے اوراقِ مصور تھے

اپنے اندر وہ کیفیات پنہاں رکھتے ہیں کہ محسوس کے آنگن میں قیام کیئے شاعر کی افتادِ طبع عاجز ہے درد کو درد لکھ سکے۔

زیر نظر تحریر مخصوص ہے دلّی کے اس مردہ معاشرے کی جس میں اجسام تو زندہ تھے مگر ساکنانِ دلّی نے اپنی خواہشات کو یاس و حسرت کا کفن دے کر گورِ سیاہ میں سپردِ فنا کیا۔ پھر لفظ لفظ لہو تھا آہ و بکا تھی، ناامیدی تھی، وحشتِ وجود تو کبھی نادیدگی فلک تھی۔ دبستان دلّی کسی شعری فن پارے کی مثال ہر گز نہیں۔ نہ ہی کسی نثری نمونے کی نشاندہی ہے بلکہ جو بیتا اس کا راست بیان ہے۔ اردو غزل کے عہد ابتدائی شعوری زمانہ کے دامنِ بیان میں محبوب کی کج ادائی، فراق و ہجر کی داستانیں، رقیب و مہبینِ، دل مضطر کے قصے ہی قصے تھے۔ مگر سیاسی، معاشی و معاشرتی حالات کی ابتری نے وہ مضامینِ فراغت گویا چھین لیے۔ ۱۷۰۷ عیسوی اورنگ زیب عالمگیر کی وفات گویا آسودگی ایک قصہ آپارینہ ہو کر اورنگزیب کے ساتھ ہی مدفون ہوئی۔

انتشار و خلفشار نے گویا تخیل کے ہر ورق پر ایسی پر درد تصاویر آویزاں کیں کہ، تصاویر بنانے کو لفظوں کے انتخاب میں ہر وہ لفظ چنا جس کا رنگ نامرادی و ناکامی، نادیدگی و نامساعدگی و نارسائی سے تعبیر ہوتا۔ ایک سو پچاس سالوں پر محیط سفر نابود میں ہر رنگ فنا پر مامور تھا۔ حسرتوں کے کھیت کھلیان تھے نا ہی امید کے پھر ایسے قصر آویزاں ہوئے یعنی جو بھی تھا اس کو ہستی سے نیستی کا سفر سبک رفتاری سے طے کرنا تھا۔ دلی کے آوارہ گلی کوچوں میں حسرت و یاس کی وہ چیخیں، دم توڑتی امنگیں ہیں کہ چند ساعت وہاں قیام کر لیا جائے تو تخیل میں بندھا ہر لفظ صورتِ لہو تعبیر ہو۔

اردو شاعری کی آبرو داخلیت سے تعبیر وہ غزل ہے جو دلّی کے انہیں آوارہ گلی کوچوں میں جوان ہوئی اپنے دامن میں وہ تمام آہیں، سسکیاں چیخیں اور دم توڑتی امنگیں رکھتی ہے کہ جس کی وجہ اردو غزل اقلیمِ سخن کے چرخِ ثمن پر تنہا مکیں ہے۔ دردؔ، سوداؔ، میرؔ ظفر

داغ حالی و مرزا غالب وقت کے وہ نباض ہیں جنہوں نے انسی شاہ گروں کی تحریرِ غلط پر وہ آہ و بکا بلند کیا گویا دلّی کا ماتم نہ ہو دلِ نامراد کا ماتم ہو۔

ابتدائے آفرینش سے تا ایں ابدالآباد کوئی شے اپنے عروج پر نہیں یہی وجہ ہے کہ ارتقاء کا عمل چہار سو جاری و ساری ہے۔ موجودات سے لے تا عالم تصورات ہر شے سابق سے آئندہ کی طرف مراجعت کرتی رہی ہے یوں اس پر کسی طور حتمی کا ادراک حدِ امکاں نا ممکن ہے۔ مگر یہ بات حقیقت سے کہیں پرے ہے کہ اردو غزل اپنے داخلی مضامین میں اپنی حتمی شکل میں موجود ہے۔ اس سے زیادہ آہ و بکا ، حسرت و یاس، مایوسی و نادیدگی اب کسی طور ضبطِ تحریر نہیں آسکتا۔

تاریخ ادب ہو یا تاریخ انسانی دونوں کے مطالعے سے یہ بات بالکل واضح ہے کہ معلوم دنیا صرف وہ ہی ہے جس پر بنی نوع انسان اپنی قدرت محسوس کر پایا ہے۔ کسی بھی شے یا فن پارے کی قدر و قیمت معین کرنے کا جو کلیہ ہمارے اذہان میں منقش ہے وہ در اصل ہمارے ذاتی تجربات، خدشات اور احساسات پر ہی مبنی ہوتا ہے۔ شاعر ہو یا ادیب کسی بھی خاص وقت میں حالات کے دھارے کو اپنے تئیں موڑتا ہے حقیقت میں اپنے احساسات و جزبات کو ضبط تحریر لا کر ایسی چیزوں کی نشاندہی ضرور کر دیتا ہے جس سے اس کے بعد آنے والوں کے لئے شاعر یا ادیب کا وہ کرب کسی نا کسی حد تک محسوس کیا جا سکتا ہے۔ مگر کیا کیجیے اس بات کا کہ ہر لفظ اپنے پس پشت احساسات و جزبات کا بحر بیکراں موجود رکھتا ہے۔

ہم کسی بھی تحریر یا فن پارے کو دیکھ کر بس اتنا ہی کرب محسوس کر سکتے ہیں جتنا شعور میں ہم نے اپنے ماضی میں کبھی محسوس کیا ہو۔ مثلاً ہاتھ یا پاؤں کی ہڈی ٹوٹنے کا درد صرف وہی محسوس کر سکتا ہے جو کبھی اس منزل سے گزرا ہو ورنہ کچھ بھی کر لیا جائے ذہن انسانی اس کرب کو احاطۂ احساسِ امکانی میں لا ہی نہیں سکتا جو کرب چشم بینا نے ذی روح اجسام کی موجودگی میں دیکھا اور محسوس نا کیا ہو۔ آج تاریخِ مغلیہ کا مطالعہ کرتے ہوئے ہم یہ بات محض ایک یا دو اشعار میں پڑھ جاتے ہیں کہ دارا شکوہ جو ایک سخی القلب شخصیت کا مالک تھا انتہائی سفاکی کے ساتھ اپنے ہی بھائی اورنگ زیب عالمگیر کے ہاتھوں قتل ہو گیا۔(۲)

جونہی کتاب بند ہوئی گویا تجسس کے میدان میں ایک حبس برپا ہو گیا۔ پھر رفتہ رفتہ فطرت انسانی اسی حبس کی کیفیت کو سر تسلیم خم کئے قبول کر لیتی ہے۔ کیونکہ قاری کو اس سے کوئی مطلب واسطہ نہیں کہ یہ سطور کا مجموعہ جو کتابی صورت میں اس کے پاس موجود ہے اس کو کتاب بننے کے لئے کن کن مراحل سے گزرنا پڑا ہو گا۔

یہی وجہ ہے کہ شاعر ہو یا ادیب ماضی کے کرب کو صرف ان ہی الفاظ کی مدد سے ضبطِ تحریر میں لاتا ہے جو الفاظ دریافت کی چکی سے کشید کئے جا چکے ہیں درد کتنا ہی جان لیوا کیوں نا ہو شدت کی گہرائی کتنی ہی ضخیم کیوں نا ہو' درد ہی لکھا جاتا ہے۔ یعنی ایجاد کے سفر نے

ابھی ایسے کوئی الفاظ ہم سفر نہیں بنائے جن سے درد کی گہرائی مختلف النوع دکھائی دی جا سکے محض اس کے، کہ اس کے ساتھ انتہائی اور شدید کے الفاظ سابقے اور لاحقے کی صورت لکھے جا سکیں۔

دلّی کا اجڑ جانا محض ایک اشارہ ہے ماضی کے ان لامتناہی حالات وواقعات کا جو کبھی نادر شاہ کے حملوں کا بیان ہے تو کبھی احمد شاہ ابدالی کی سفاکی جو اس نے دلّی کے ساتھ برتی۔ دلّی کا مرثیہ محض ان شاہ گروں کا بیان نہیں ہے جنہوں نے چند لمحوں میں دلّی کی گلیوں میں خونریزی کی تاریخیں رقم کرویں۔ بلکہ دلّی کا مرثیہ تو دراصل ان لمحات کی ترجمانی ہے جب جب قلب انسانی نے اپنے گرد موجود خوشیوں کے حصار کو کمزور ہوتے دیکھا۔ یہاں دلّی کا ذکر مخصوص یوں بھی ہے کہ اردو غزل نے جس دامن سے لولوءِ مرجان چنے ہیں وہ دامنِ وسیع دلّی ہی کی پوشاک خستہ کا حصہ رہا ہے۔

میر تقی میرؔ:

- گھر جلا سامنے پر ہم سے بجھایا نہ گیا(۳)
- پڑھیں گے شعر رو رو لوگ بیٹھے — رہے گا تا دیر ماتم ہمارا(۴)
- دل کی ویرانی کا کیا مذکور ہے — یہ نگر سو مرتبہ لوٹا گیا(۵)
- پڑھتے پھریں گے گلیوں میں ان ریختوں کو لوگ — مدت رہیں گی یاد یہ باتیں ہماریاں(۶)

تر دامنی کا قصہ ہو، زلفِ پریشاں کا گریہ ہو، دلِ نامراد کا ماتم ہو، رقصِ ہجراں ہو چہار سو، ہو کاہشِ زنداں کی داستان، حریصِ مزاجِ دہر کی کوئی بات ہو، قرقِ اضطراب ہو، احتیاجِ بیان عشق ہو یا نائرہ غضب میں مبتلا ہو، حریمِ تصورِ پردۂ جبیں پر کوئی نقش آویزاں ہوتا ہے تو ذاتِ کائن میر تقی میرؔ سا سیُ بے نوا ہی ٹھہرتے ہیں۔ میر کا دل کیا تھا؟ دلِ نادیدہ تھا یا کہیں تو تمام عمر قصہ مہجوری میں قید مہبینِ دہر تھا۔

ہزار ہا مشکلات دکھ درد کا بیان دلِ بے قرار و دلِ مبتلائے عشق، آماجگاہِ انقلابات گویا اپنے وقت کا ہر دکھ ہر درد دامن میں لیئے دبستان دلّی یا دبستانِ آواخ واندوہ تخیل کا وہ مینار ہے کہ جس نے گلشنِ سخنوراں میں جتنے لؤلوءِ مرجان عطا کیے دنیا کی کسی زبان و ادب میں ایسے سخن ور خال خال ہی موجود ہوں۔ دکھ درد، محرومی، آہ و بکا، گریاوزاری کے وہ قرینے سکھائے کہ دلّی کی ہر گلی ہر کوچے ہر بازار سے بانگِ مغموم بلند ہوئی۔ ہئیت و تصور کی کل کائنات جو دلّی سے مخصوص ہے داخلیت کا منبع ہے، داخلیت سے مزئین تغزل دبستانِ دلّی کو وہ مقام اولٰی عطا کرتا ہے جو کسی اور زبان و ادب میں کم کم ہی تصور کیا جا سکتا ہے۔ صنفِ شعری میں غزل وہ صنف ہے کہ جس نے آئینہِ وقت پر جو نقش ابھارے وہ حقیقت سے تمسک رکھتے ہیں۔

اردو غزل کی خوش نصیبی ہے کہ میرؔ و غالبؔ جیسے بلند پایا شعراء دامن عاطفت میں متمکن ہیں۔

؎ الٹی ہو گئیں سب تدبیریں کچھ نہ دوا نے کام کیا — دیکھا اس بیماری دل نے آخر کام تمام کیا
عہدِ جوانی رو رو کاٹا پیری میں لیں آنکھیں موند — یعنی رات بہت تھے جاگے صبح ہوئی آرام کیا
ناحق ہم مجبوروں پر یہ تہمت ہے مختاری کی — چاہتے ہیں سو آپ کریں ہیں ہم کو عبث بدنام کیا
یاں کے سپید و سیاہ میں ہم کو دخل جو ہے سو اتنا ہے — رات کو رو رو صبح کیا یا دن کو جوں توں شام کیا (۷)

میر کی زندگی دکھ اور آہ سے تعبیر ہے نامحرومی کے قصے ہیں تو حالات کے ساتھ سوتیلوں کا سوتیلا پن ہے۔ نادر شاہ نے گویا قہر خداوندی کی صورت دلّی اور ساکنانِ دلّی کا چین غارت کر دیا۔ محمد شاہ رنگیلا بادشاہِ وقت گویا جاہ و جلال کا ایک نقشے خیالی سے بڑھ کر کچھ نا تھا۔ میر دلّی کا مرثیہ یوں پڑھتے ہیں۔

؎ سخن مشتاق ہے عالم ہمارا — بہت عالم کرے گا غم ہمارا
پڑھیں گے شیروں لوگ بیٹھے — رہے گا دیر تک ماتم ہمارا
زمین و آسماں زیر و زبر ہیں — نہیں کم حشر سے اودھم ہمارا
کسو کے بالِ برہم دیکھتے میر — ہوا ہے کام دل برہم ہمارا (۸)
؎ میرے سلیقے سے میری نبھی محبت میں — تمام عمر میں ناکامیوں سے کام لیا (۹)

دبستان دلّی میں تخیل کو چرخِ سبعہ پر براجمان کرانے والے شعراء کا طرہ امتیاز دراصل راست گوئی تھی۔ بشکلِ کلام میر و غالب درد و سودا اور دیگر شعراء نے واردات قلبی کو گویا داخلی کیفیات سے ممیز کیا غم دوراں غم جاناں ہوا۔ مصطفی زیدی گو کہ اس دور کے ہر گز نہیں مگر ان کا یہ کلام بر محل ہے،

مصطفی زیدی

؎ غم دوراں نے بھی سیکھے غم جاناں کے چلن — وہی سوچی ہوئی چالیں وہی بے ساختہ پن
کونسی فصل میں اس بار ملے ہیں تجھ سے — ہم کو پروا ہِ گریباں ہے نہ فکرِ دامن
ایسی سونی تو کبھی شامِ غریباں بھی نہ تھی — دل بجھے جاتے ہیں اے تیرگیٔ صبح وطن (۱۰)
میر دل کی آبادی کی اس حد ہے خرابی کہ نہ پوچھ — جانا جاتا ہے کہ اس راہ سے لشکر نکلا (۱۱)

میر کے مضامین شعری گو کے داخلی عوامل کے مینار ہیں ان میں خارجیت کا عنصر ہو کر بھی داخلیت ہی حاوی نظر آتی ہے۔

؎ اقرار میں کہاں ہے انکار کی سی خوبی — ہوتا ہے شوق غالب اس کی نہیں نہیں پر (۱۲)

میر کا عشق ارضی وجود کا متلاشی رہا سوتیلے ماموں زاد بھائی نے اپنے والد کو خط لکھ کر میر کو فتنہ روز گار سے مثال دی اور ماموں نے سوتیلے پن کا مظاہرہ کر کے میر کے مبتلائے عشق میں وہ رقابت پیوست کی کے ایک وقت میر پر محبت میں دیوانگی غالب رہی۔ ایک طرف تو زندگی کی ہر آسائش کا ناپید ہونا تھا دوسری طرف دلّی شہر کی بربادی گویا میؔر کی زندگی تا ہجرِ لکھنؤ دکھوں اور تکالیف کا استعارہ رہی۔ میؔر کا عشق جہاں ایک طرف معشوقہ کی کج ادائی کا بیان تھا تو دوسری طرف دلی شہر بھی تھا، لکھنؤ میں ایک مشاعرے میں اپنی آن بان کے ساتھ شرکت پر کچھ طفلِ نوخیز منچلوں کے سوال پر اپنا تعارف کچھ ایسے انداز میں پیش کیا جس کی مثال کسی اور شاعر کے کلام میں ہر گز ہر گز نہیں ملتی۔ مشاعرے کا سن کر محفل میں شرکت پہ ٹھانی 'شمع بزم جب سامنے آئی تو تعارف درکار ہوا آہ بھر کر کہتے ہیں،

؎ کیا بود و باش پوچھو ہو پورب کے ساکنو ہم کو غریب جان کے ہنس ہنس پکار کے
دلّی جو ایک شہر تھا عالم میں انتخاب رہتے تھے منتخب ہی جہاں روز گار سے
اس کو فلک نے لوٹ کے ویران کر دیا ہم رہنے والے ہیں اسی اجڑے دیار کے (۱۳)

جب سب کو حال معلوم ہوا تو سب نے میؔر سے معذرت چاہی میؔر کی آمد زبان زد عام ہوئی تو آصف الدولہ نے قدر دانی کا مظاہرہ اس طور کیا دو سو روپیہ ماہوار وظیفہ مقرر کر دیا۔

دلّی کا غم ہے گویا تمام عالم کے دکھ درد کو سمیٹ کر مد مقابل ٹھہرایا جائے تب بھی شاید پیرائیہ اظہار میں وہ مضامین جانہ پا سکیں جو دلّی کا طرہ امتیاز ہے۔ تیموری سلطنت کے زوال کی تصویر اس طریق بیان کرتے ہیں

؎ رکھے تاجِ زر کو سر پر چمن زمانے میں گل ناشگفتہ ہوں اتنا کہ خزاں ہے یہ بہاراں
نہیں تجھ کو چشمِ عبرت یہ نمود میں ہے ورنہ کہہ گئے ہیں خاک میں ملکئ تجھ سے تاجوریاں (۱۴)

بادشاہانِ وقت کی تذلیل کے ان کو تخت سے اتار کر اندھا کروا دینے کی ایک رسم پر ناشاد و نامرادی کا ماتم یوں کرتے نظر آتے ہیں-

؎ شہاں کے کحل جواہر تھی خاک پا جن کی انہیں کی آنکھوں میں پھرتی سلائیاں دیکھیں (۱۵)

دبستان دلّی کی داخلیت کے سربر آوردہ شاعر اپنی عظمت کے بارے میں یوں باوثوق پیشن گوئی کرتے ہیں

؎ پڑھتے پھریں گے گلیوں میں ان ریختوں کو لوگ مدت رہیں گی یاد یہ باتیں ہماریاں (۱۶)

شہنشاہ تغزل، آبروٗ اردو غزل میر تقی میؔر ۱۸۱۰ عیسوی میں آسودۂ خاک ہوئے۔ (۱۷)

دبستان دلّی کسی شعری فن پارے کی مثال ہر گز نہیں نا ہی کسی نثری تمثیل کی نشاندہی ہے، بلکہ جو بیتی اس کا راست بیان ہے۔ اردو غزل کے ابتدائے شعوری زمانہ کے دامنِ بیان میں محبوب کی کج ادائیاں، فراق و ہجر کی داستانیں، رقیب و مہبینِ دلِ مضطر کے قصے ہی تھے۔ مگر سیاسی و معاشی حالات کی ابتری نے وہ مضامینِ فراغت گویا چھین لیے ۱۷۰۷ عیسوی میں اورنگ زیب کی وفات گویا آسودگی ایک قصہ پارینہ ہو کر اورنگزیب کے ساتھ ہی مدفون ہوئی۔ انتشار و خلفشار نے گویا تخیل کے ہر ورق پر پُر درد تصاویر آویزاں کیں۔ وہی پر درد تصاویر بنانے کو لفظوں کا انتخاب ہر وہ لفظ چن دیتا جس کا رنگ نامرادی و ناکامی، نادیدگی و نامساعدگی یا نارسائی سے تعبیر ہوتا۔ ایک سو پچاس سالوں پر محیط سفر نابود میں ہر رنگ فناء پر مامور تھا۔ ناحسرتوں کے کھیت کھلیان تھے نا ہی امید کے قصر آویزاں ہوئے یعنی جو بھی تھا اس کو ہستی سے نیستی کا سفر سبک رفتاری سے طے کرنا تھا۔

"دلّی کے آوارہ گلی کوچوں میں حسرت و یاس کی وہ پر درد چیخیں, اس میں دم توڑتی وہ امنگیں ہیں کہ اگر ان گلی کوچوں میں چند دقیقے قیام کیا جائے تو تخیل میں بندھا ہر مضمون خون لکھے"

مرزا اسد اللہ خان غالبؔ
گر زوقِ سخن بدھر آئین بودی
دیوانِ مرا شھرتِ پروین بو دی
غالب اگر این فنِ سخن دین بودی
آن دین را ایزدی کتابِ این بودی (۱۸)

چرخِ ثمن پر تخیل کے تنہا مکیں، بیان میں مطلق العنان، صاحبِ وقوف، طائرے کشف با اندازِ روشن طبع، عظمتِ ہفت اقلیم کے مہر و ماہ، لہجہ بہشت نژاد، رگِ حمیت و انانیت کے مہرِ مبین، بربادیٔ دلّی پر نوحہ کناں، شاعر فہم و ذکا اسد اللہ خان غالبؔ جن کی تعریف و توصیف کے لئے بس یہی کہاوت معنیٰ و مفہوم میں پیر کامل کی کہاوت کے مترادف ہے کہ "غالبؔ علیٰ کلِ غالب"

غالبؔ کے کلام پر کوئی تبصرہ نہ فکر اسکی اجازت دیتی نا اختراع کے سانچے میں کسی ایجاد کی کشید ممکن۔ پس دبستانِ دلّی میں خاص داخلی کیفیات کو مضمون میں شمار کر لیں گے۔ اردو غزل کو جو مقام دلّی کی بربادی کے بیان نے عطا کیا وہ کسی طور اس کے علاوہ ممکن نہیں تھا، دوسری طرف میرؔ و غالبؔ جیسے عظیم چرخِ تخیل بخشے۔ دکن سے غزل کا میلان پاتے ہی حسِ شعری میں دہلوی روزمروں اور فارسی جامعہ کی آمیزش کا سامنا رہا جس سے اردو غزل نے ایسے نت نئے مضامین پائے کے دنیا کی دیگر زبانوں میں اس جیسی مثال خال خال ہی نظر آتی ہے۔

اردو شاعری میں فلسفیانہ اسلوب تغزل کے آدمِ اول اگرچہ خواجہ میر دؔرد کہلاتے ہیں، مگر کسی طور کسی بیان اسد اللہ خان غالؔب دردؔ سے کم نہیں۔ یوں فلسفیانہ اسلوب کے آدم ثانی مرزا اسد اللہ خان غالؔب ہی زیب دیتے۔

کچھ دیر دونوں عزام میؔر و غالؔب کے تخیل کو سامنے رکھ کر جائزہ مخصوص ٹھہرے تو یہ بات ضرور دیکھی جاسکتی ہے کہ میؔر کے کلام میں دلِ شکستگی نے نامرادی کے ساتھ ہستیِ بے بال و پر مجبوری عطا کی۔

آہ کس ڈھب سے روئیے کم کم　　شوق حد سے زیادہ ہے ہم کو
نامرادانہ زیست کرتا تھا　　میرؔ کا طور یاد ہے ہم کو (۱۹)

لیکن اگر غالؔب کو بطورِ عاشقِ مہر جبیں دیکھتے ہیں تو وہ ہمیں اس قدر نامراد نظر نہیں آتے ہیں یا ممکن ہے کے عشق میں گرفتار رہے ہوں مگر جیسا کہ ان کے لیے کہا جاتا تھا کہ "چُناجان نہ سہی مناجان ہی سہی" کے مترادف یہ خیال حقیقی معلوم ہوتا ہے،

سیکھے ہیں مہ رُخوں کے لیے ہم مصوّری　　تقریب کچھ تو بہرِ ملاقات چاہیے (۲۰)

غالب کا زمانہ گو میؔر سے قدرے مختلف تھا میؔر نے ستم ہائے روزگار جو بسر کیا ان کے ہم عصروں نے کم و بیش اپنی اپنی استطاعت ذہنی و قوع، نگہہ مخصوص سے رقم کیا ہے۔ غالؔب نے جو حالات اپنے اطراف پائے ان میں بادشاہت کا جاہ و جلال ناپید تھا۔ بس اس قدر کے شعراء اہلِ فن اپنی جناب میں شاہانِ وقت کو اہل فن کا قدردان پاتے۔ مراحم خسروانہ تو کبھی خلعتِ شاہانہ و جاگیر پاتے۔ غالب کا دکھ قدرے مختلف تھا اوائل عمری کی پریشانیاں، کاہشِ کلکتہ، قرقِ جائیداد و وظیفہ، اولاد سے محرومی ناگاہ ہر دکھ پردہ تخیل پر نئی واردات رقم کرتا۔

نہ ہوئی گر مرے مرنے سے تسلی نہ سہی　　امتحان اور بھی باقی ہو تو یہ بھی نہ سہی (۲۱)

اسی غزل میں ایک جگہ غموں کے درمیان ملنے والی خوشی پر عجیب انداز میں کہتے ہیں،

مے پرستاں! خم مے منہ سے لگائے ہی بنے　　ایک دن گر نہ ہوا بزم میں ساقی نہ سہی (۲۲)

مرزا غالؔب عشق میں بھی اپنے آپ کو اس قدر مگن پاتے ہیں کہ گویا رقیب ہو کے جلاد جو ہماری جان کے درپے ہے اس سے بھی آج ہمیں کوئی خوف نہیں۔

عجب نشاط سے جلاد کے چلے ہیں ہم آگے　　کہ اپنے سایہ سے سر پاؤں سے ہے دو قدم آگے
قضا نے تھا مجھے چاہا خرابِ بادہ الفت　　فقط خراب لکھا بس نہ چل سکا قلم آگے (۲۳)

یا تو یہ عالم اطمینان کا ہے سب کچھ لٹا دینے کے بعد اب ہمیں کسی سے اپنے معشوق کو کھو دینے کا کوئی غم کوئی دکھ نہیں، یا نا امیدی کی منزلِ آخر ہے کہ اب امید کی بھی کوئی امید باقی نہیں مجھے۔

؎ خزاں کیا؟ فصلِ گل کہتے ہیں کس کو؟ کوئی موسم ہو! وہی ہم ہیں، قفس ہے اور ماتم بال و پر کا ہے (۲۴)
مجھ سے مت کہہ 'تو ہمیں کہتا تھا اپنی زندگی' زندگی سے بھی مرا جی ان دنوں بیزار ہے (۲۵)

جہاں عشق مجازی خود کو مکمل طور پر عشق حقیقی کی راہوں میں بے بال و پر پاتا ہے مگر غاؔلب کے تصوف نے ان کو ایسا فلسفیانہ اسلوب بخشا کے نہ وہ غاؔلب سے قبل کہیں نظر آتا ہے نہ غاؔلب کے بعد حریمِ تخیل میں کسی ذہنی استطاعت کے تصرف میں قائم۔

؎ ہیں آج کیوں ذلیل؟ کہ کل تک تھی ناپسند گستاخیِ فرشتہ ہماری جناب میں (۲۶)

وہ آدم کے پتلے پر انکار سے عزازیل کا ذلیل اور رسوا ہونا عدل ٹھہرا مگر آج انسان اس قدر پست در پست ہے اس کا کوئی مداوا ہی نہیں۔ تلمیحات کا یہ کمال استعمال اردو غزل کے کسی بھی دور کے شعراء میں معدودِ چند ہی نظر آتا ہے۔

صمند عمر تھم جائے حضرت انسان کی روز اول سے یہی خواہش رہی ہے۔ مرزا غاؔلب سفینۂ عمر نابود کے ساحل پر تیزی سے غرقاب ہو جانے کی پریشانی کے غم میں یوں کہتے ہیں

؎ رو میں ہے رخشِ عمر کہاں دیکھیے تھمے نے ہاتھ باگ پر ہے، نہ پا ہے رکاب میں (۲۷)

سمندِ عمر کی رفتار پر حیران و پریشان ہیں کہ نہ تو باگ ہمارے ہاتھ ہے اور نہ پاؤں رکاب پر۔ حد امکان کو گورِ سیاہ رکھا کہ گویا سفینۂ عمر عالمِ حوادث سے جس قدر تیزی سے کوچ کر رہا ہے وہ اب ساحلِ نابود پر ہی دم لے گا۔

دلّی اجڑی مال و متعِ فنا کی گھاٹ اتر کر چراغِ ناتمنائی کی مانند دودِ سیاہ ہوا۔ کسی کو کسی کی نہ رہی سب اپنی آپ میں لگن کی ہوت مضطرب پائے۔ مرزا غاؔلب اور ان کے دوستوں پر بھی قیامت برپا ہوئی۔ مرزا غاؔلب پر بھی دشمنوں کی اعانت کا الزام لگا 'دستنبو' نیز ملکہ برطانیہ کی شان میں قصیدہ لکھ کر گویا طوقِ حزیمت گلے سے اتار پھینک دینے کی کوشش کی۔ پھر سرسید اور ان کے رفقاء کی کوششوں سے وظیفہ بحال ہوا اور حالات کی سنگینی نے تھم کر مشکلات میں کمی کا اعلان کیا۔ غدر نے خیال کے ہر موتی کو اپنے آپ میں رنگا یوں غاؔلب اور غدر پر نہ کہیں تو یہ ممکن ہی نا تھا۔

؎ ہو چکیں غالب بلائیں سب تمام ایک مرگ ناگہانی اور ہے (۲۸)
پھر مجھے دیدہ تر یاد آیا دل جگر تشنہ فریاد آیا

دم لیا تھا نہ قیامت نے ہنوز
پھر ترا وقت سفر یاد آیا

کوئی ویرانی سی ویرانی ہے
دشت کو دیکھ کے گھر یاد آیا (۲۹)

ذکر اس پری وش کا اور پھر بیاں اپنا
بن گیا رقیب آخر تھا جو رازداں اپنا

دے وہ جس قدر ذلت ہم ہنسی میں ٹالیں گے
بارے آشنا نکلا ان کا پاسباں نکلا

گھستے گھستے مٹ جاتا آپ نے عبث بدلا
ننگِ سجدہ سے میرے سنگِ آستاں اپنا

ہم کہاں کے دانا تھے کس ہنر میں یکتا تھے
بے سبب ہوا غالب دشمن آسماں اپنا (۳۰)

عشرت قطرہ ہے دریا میں فنا ہو جانا
درد کا حد سے گزرنا ہے دوا ہو جانا (۳۱)

آئے ہے بے کسی عشق پہ رونا غالب
کس کے گھر جائے گا سیلابِ بلا میرے بعد (۳۲)

نا گل نغمہ ہوں نا پردہ ساز
میں ہوں اپنی شکست کی آواز (۳۳)

فکر دنیا میں سر کھپاتا ہوں
میں کہاں اور یہ وبال کہاں (۳۴)

قفس میں مجھ سے رودادِ چمن کہتے نہ ڈر ہمدم
گری ہے جس پہ کل بجلی وہ میرا آشیاں کیوں ہو (۳۵)

تکالیف و محرومی کا عمیق سمندر لیے کبھی راحتوں کی بخشش، کبھی ظلمتوں کے ڈیرے، سمیٹے سفینۂ زیست ۱۸۱۰عیسوی میں ساحلِ نابو پر راہِ عدم ہوئی۔ آہ! مرزا اسد اللہ خان غالؔب

بوئے گل نالہ دل دودِ چراغِ محفل
جو تری بزم سے نکلا سو پریشاں نکلا (۳۶)

تحریر کی یہ بہاریں ابھی جوبن پر نہیں، خواہشِ ناتمام کی صورت غالؔب کی کئی پہلو داریاں ذہن سے رہا ہو کر قلم کی سپردگی کی متمنی ہیں کہ لفظوں کا پیراہن بخشا جاسکے۔ قصۂ ناتمام-غالؔب (۳۷)

حالات و واقعات بہ ظاہر ایک سیاسی نقش و نگار سے ہی تعبیر ہوا کرتے ہیں مگر ان حالات کا اثر تادیر اور ذہن رساؤں کی سوچ ان کی فکر و تہذیب و تمدن سے چھلکتا ہے جو حساس طبیعت کے مالک ہوا کرتے ہیں۔ حالات کا خراب ہونا شہر دلّی کا تباہ ہونا شرفاء و امراء کا دلّی سے کوچ کر جانا محض زندگی کے توازن کو برقرار رکھنے کی کوشش ہی نہ تھی بلکہ مزاجِ دہر کی پسپائی کا اقرار بھی تھا۔ حالات کی آسودگی جب کرب کے دامن میں قیام کرتی ہے اوراقِ بریدا اس ایسے کرب ناک احساسات کا اظہار یہ بن جاتے ہیں کہ اتنی صدیاں بیت جانے کے باوجود بھی ہم اس درد کو اپنے دلِ مضطرب میں شرفِ اولیں قرار دیتے ہیں۔ یا یوں کہیں احساس کی دہلیز پر اگر آسودگی ہی پناہ پائے تو شاید داستانِ

وقت قطعی طور پر مختلف المزاج کا امتزاج ثابت نہ ہوتی۔ مزاجِ دہر نے اپنا کرب جب حساس نفوس پر کندہ کیا طبع زاد اذہان کے رسیا اس کرب کو اپنی اپنی جہتوں کے زیرِ اثر نقش کرتے نظر آئے۔

بے چینی کرب اضطراب کی محافل نہ ہوتیں تو شاید دلّی کا ذکر فسانۂ کہن کی مانند طاق نسیاں کی زینت بن چکا ہوتا۔ پلاسی کی جنگ نواب سراج الدولہ کی گرفتاری اور دردناک موت نے تاریخ کی بے نوائی کو ایسے ہجوم بلا میں دھکیل دیا کہ وقت کے گرم و سرد سراج الدولہ کی شخصیت کے پہلو کو کسی طور پر چرخِ چہارم سے نیچے نا اتار پائیں گے۔ مرشد آباد کا کہرام ہو یا عظیم آباد (پٹنہ) میں سراج الدولہ کی اندوہناک موت پر عوام الناس کا نوحہ کناں ہونا یقیناً اس امر کی جانب توجہ ہے کہ غزل ہو یا اصنافِ شعری کی کوئی مثال دیگر سخنوروں کو جو مضامین حالات ناپائیداری نے مہیا کیے وہ آسودگی نے نہ کیے۔

حوالہ جات:

۱۔ کاظم زیدی، سید محمد، سابق پروفیسر شعبہ اردو، گورنمنٹ ممتاز کالج، خیرپور، غیر مطبوعہ کلام۔

۲۔ صلاح الدین ناسک، دور مغلیہ، عزیز بک ڈپو-اردو بازار لاہور ۱۹۷۳

۳۔ میر تقی میر، کلیاتِ غزلیاتِ میر، الفیصل ناشران، لاہور، ۲۰۱۳، ص ۱۰۱

۴۔ ایضاً ص ۲۴۷ ۵۔ ایضاً ص ۹۵ ۶۔ ایضاً ص ۴۵۳ ۷۔ ایضاً ص ۷۵ ۸۔ ایضاً ص ۲۴۷ ۹۔ ایضاً ص ۸۴

۱۰۔ مشمولہ فنون، جدید غزل نمبر، جلد ۸، شمارہ ۳۔۴، لاہور، ادارہ احمد ندیم قاسمی حبیب اشعر دہلوی، ۱۹۷۹، ص ۸۱۶

۱۱۔ میر تقی میر، کلیاتِ غزلیاتِ میر، الفیصل ناشران، لاہور، ۲۰۱۳، ص ۹۳

۱۲۔ ایضاً ص ۳۵۲

۱۳۔ آزاد، محمد حسین، مولانا، آبِ حیات، نوں کشور پرنٹنگ ورکس، لاہور، ۱۹۰۷، ص ۱۹۶

۱۴۔ میر تقی میر، کلیاتِ غزلیاتِ میر، الفیصل ناشران، لاہور، ۲۰۱۳، ص ۴۴۹۔۴۵۰

۱۵۔ ایضاً ص ۴۶۱ ۱۶۔ ایضاً ص ۴۵۳

۱۷۔ پرویز خواجہ احمد فاروقی، میر تقی میرؔ حیات اور شاعری، انجمن ترقی اردو (ہند) نئی دلّی، ۱۹۵۴

۱۸۔ سید تقی، ڈاکٹر، عابدی، کلیاتِ غالب فارسی، اصیلا آفیسٹ پریس، دہلی، س ن، ص ۸۵۲

۱۹۔ میر تقی میر، کلیاتِ غزلیاتِ میر، الفیصل ناشران، لاہور، ۲۰۱۳، ص ۵۴۹

۲۰۔ غالب، دیوانِ غالب جدید، مدھیہ پردیش اردو اکادمی، بھوپال، ۱۹۸۲، ص ۳۸۸

۲۱۔ ایضاً ص ۳۲۱ ۲۲۔ ایضاً ص ۳۲۱ ۲۳۔ ایضاً ص ۴۰۲ ۲۴۔ ایضاً ص ۳۳۵

۲۵۔ ایضاً ص ۳۳۳ ۲۶۔ ایضاً ص ۲۷۸ ۲۷۔ ایضاً ص ۲۷۸ ۲۸۔ ایضاً ص ۳۹۵

۲۹۔ ایضاً ص ۱۷۰ ۳۰۔ ایضاً ص ۱۹۵۔۱۹۶ ۳۱۔ ایضاً ص ۱۹۷ ۳۲۔ ایضاً ص ۲۱۳

۳۳۔ ایضاً ص۲۲۷ ۳۴۔ ایضاً ص۲۵۵ ۳۵۔ ایضاً ص۲۹۹ ۳۶۔ ایضاً ص۱۵۱

۳۷۔ الطاف حسین حالؔی، یادگارِ غالب، چمن بک ڈپو اردو بازار دہلی، س۔ن

کتابیات:

۱۔ **آزاد، محمد حسین، مولانا۔** *آبِ حیات*۔ نول کشور پرنٹنگ ورکس، لاہور، ۱۹۰۷ء۔

۲۔ **الطاف حسین حالی۔** *یادگارِ غالب*۔ چمن بک ڈپو، اردو بازار، دہلی، س۔ن۔

۳۔ **پرویز، خواجہ احمد فاروقی۔** *میر تقی میرؔ: حیات اور شاعری*۔ انجمنِ ترقی اردو (ہند)، نئی دہلی، ۱۹۵۴ء۔

۴۔ **سید تقی، ڈاکٹر عابدی۔** *کلیاتِ غالب فارسی*۔ اصیلا آفسٹ پریس، دہلی، س۔ن۔

۵۔ **صلاح الدین ناسک۔** *دَورِ مغلیہ*۔ عزیز بک ڈپو، اردو بازار، لاہور، ۱۹۷۳ء۔

۶۔ **غالب، مرزا اسد اللہ خاں۔** *دیوانِ غالب (جدید ایڈیشن)*. مدھیہ پردیش اردو اکادمی، بھوپال، ۱۹۸۲ء۔

۸۔ **کاظم زیدی، سید محمد۔** *غیر مطبوعہ کلام*۔ سابق پروفیسر، شعبۂ اردو، گورنمنٹ ممتاز کالج، خیر پور۔

۹۔ **مشمولہ: "فنون"**۔ *جدید غزل نمبر*، جلد ۸، شمارہ ۳–۴۔ ادارہ احمد ندیم قاسمی، لاہور، ۱۹۷۹ء۔

۱۰۔ **میر، تقی میر۔** *کلیاتِ غزلیاتِ میر*۔ الفیصل ناشران، لاہور، ۲۰۱۳ء۔

Bibliography:

1. Azad, Muhammad Husain, Maulana. Aab-e-Hayat. Nau Kishore Printing Works, Lahore, 1907.
2. Ghalib, Mirza Asadullah Khan. Diwan-e-Ghalib (Jadeed Edition). Madhya Pradesh Urdu Academy, Bhopal, 1982.
3. Hali, Altaf Husain. Yadgar-e-Ghalib. Chaman Book Depot, Urdu Bazaar Delhi, n.d.
4. Kazim Zaidi, Syed Muhammad. Ghair Matboo‘ah Kalam. Former Professor, Department of Urdu, Government Mumtaz College, Khairpur.
5. Mashmoola: “Funoon”. Jadeed Ghazal Number, Vol. 8, Nos. 3–4. Idara Ahmad Nadeem Qasmi, Lahore, 1979.
6. Mir, Taqi Mir. Kulliyat-e-Ghazliyat-e-Mir. Al-Faisal Nashiran, Lahore, 2013.
7. Nasek, Salah-ud-Din. Daur-e-Mughliya. Aziz Book Depot, Urdu Bazaar Lahore, 1973.
8. Parvez, Khwaja Ahmad Farooqi. Mir Taqi Mir: Hayat aur Shairi. Anjuman-e-Taraqqi-e-Urdu (Hind), New Delhi, 1954.
9. Syed Taqi, Dr. Abidi. Kulliyat-e-Ghalib (Farsi). Asila Offset Press, Delhi, n.d.

☆☆☆☆☆